(غلام گردش)

بگاڑ کی اصل وجہ کیا ہے!

لائل پور سے حسن ابدال جانے کیلئے ریلوے ایک شاندار ذریعہ سفر تھا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ 1972 میں کیڈٹ کالج جانے کیلئے ٹرین میں اپنے والد محترم راؤ محمد حیات کے ساتھ ریل گاڑی میں پنڈی تک گیا۔ آٹھویں کلاس کے لڑکے کو کتنا شعور ہوگا۔ اس پر جواب یہی ہونا چاہیے کہ بہت کم۔ پر عجیب بات تھی کہ میں اس وقت اور آج بھی عام سے واقعات کو اپنے اندر سمو لیتا ہوں۔ ابھی تک یاد ہے کہ کمپارٹمنٹ حد درجہ آرام دہ تھا۔ چوڑی برتھیں اور ان پر بستر آرام سے لگ جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ، انتہائی محفوظ سفر۔ پنڈی کا ریلوے سٹیشن، چالیس پنتالیس برس پہلے تقریباً ویسا ہی تھا، جیسے آج ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج شائد تھوڑا سا بڑا کر دیا گیا ہے۔ سٹیشن پر مسافروں کیلئے ہر سہولت موجود تھی۔ ذہن میں، پنڈی سٹیشن پر ویٹنگ روم آج تک ذہن پر نقش ہے۔ ہاں، ایک ضروری بات۔ ٹرین میں معقول کھانا بھی دستیاب ہوتا تھا۔ ڈائنگ کار سے لیکر، سفید وردی میں ملبوس ویٹر، کس کمال مہارت سے ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے تک ٹرے لیجاتے تھے۔ توازن دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ عجیب بات ہے کہ اب کسی بھی بات پر حیرت نہیں ہوتی۔ عام لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر اور خواص کے کردار اور بیانات کو دیکھ کر بھی۔ شائد یہ ذہنی پختگی کی منزل ہے یا گیان کی۔ وثوق سے کچھ بھی کہنا ناممکن ہے۔ ٹرین کے سفر اور سہولتوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہمارا ریلوے کا نظام حد درجہ اچھا تھا۔ 1972 سے لیکر 1977 تک مسلسل، لائل پور سے حسن ابدال سفر کرتا رہا۔ پورے پانچ برس کبھی بھی ریلوے کے نظام سے شکایت نہیں ہوئی۔ درست ہے، کبھی کبھی ٹرین تاخیر سے آتی تھی۔ مگر مجموعی طور پر ٹرین کا سفر محفوظ ترین سفر شمار ہوتا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ اس وقت نظام، انگریز چلا رہے تھے یا غیر ملکی ہر طرف اہم عہدوں پر براجمان تھے۔ ریلوے کا تمام سٹاف اسی ملک کے لوگ تھے۔ نظام کے بہتر ہونے کا اس اَمر سے بھی اندازہ لگایئے کہ گارڈ کی وردی حد درجہ خوبصورت اور صاف ستھری ہوتی تھی۔ کوٹ کے چمکتے ہوئے بٹن، سفید قمیص، گہرے رنگ کا ڈبل بریسٹ کوٹ اور پینٹ۔ اس وقت ریلوے خسارے میں تھا یا منافع میں۔ یہ تو عرض نہیں کر سکتا۔ مگر مجموعی طور پر ریلوے کے نظام سے ہر پاکستان مطمئن تھا۔ میرے سمیت۔

دوسرے حکومتی ادارے کی بات کرتا ہوں۔ وہ تھا سرکاری بسوں کا محکمہ۔ جسے جی۔ ٹی۔ ایس کہا جاتا تھا۔ لاہور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں 78-77 میں داخلہ ملا تو لائل پور، فیصل آباد، بن چکا تھا۔ آنے جانے کیلئے سرکاری بسیں حد درجہ آرام دہ اور اچھے معیار کی تھیں۔ کم از کم پرائیویٹ بسوں سے ہزار گنا بہتر۔ لاہور میں جی ٹی ایس کی بسیں، ریلوے سٹیشن سے تھوڑا سا دور ایک سرکاری بس اَڈے سے روانہ ہوتی تھیں۔ کشادہ اور آرام دہ سفر۔ ان میں کسی قسم کی بدبو بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت سفر کے دوران سگریٹ پینے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مگر شاذ و نادر ہی کسی کو بس میں سگریٹ پیتے دیکھا۔ ڈرائیور بھی سادہ سی یونیفارم پہنتا تھا۔ فیصل آباد سے لاہور تک اچھا سفر تھا۔ سرکاری شعبے میں ٹرین اور بسوں کی بدولت حکومت براہِ راست عوام کے مفاد سے وابستہ نظر آتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے، یہی کوئی پندرہ بیس سال پہلے، جی ٹی ایس بند کر دی گئی۔ انکی بیش قیمت زمین، ادنیٰ داموں پر نیلام ہوگئی۔ بسیں کباڑیوں کے ہاں پہنچ گئیں۔ ریلوے اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ مکمل نجکاری سے بچ گئی۔ بہر حال نج کاری ایک خاص منصوبہ بندی سے حکومت کے اچھے

اداروں کو برباد کرتی چلی گئی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ نجکاری کے خلاف نہیں۔ مگر اصل نکتہ تو عوام کی بھلائی ہے، حکومت کا کام پیسہ کمانا نہیں۔ اس کام کیلئے تو سیٹھ موجود ہیں جو لوگوں کی جیب پر قانونی طریقے سے روز ڈاکہ مارتے ہیں۔ مگر پھر بھی معزز کہلاتے ہیں۔ وہ عام لوگ جنکی کمائی روزان لٹیروں کی تجوری میں چلی جاتی ہے۔ بیوقوف، سادہ اور جاہل عوام کہلاتی ہے۔ ریلوے اور جی ٹی ایس سے آپ پی آئی اے کی طرف آیئے۔ جہاز پر پہلا سفر 1975 میں کیا۔ والد مرحوم ملتان میں سیشن جج تھے۔ انکے ایک پرانے دوست، شیخ رزاق ،ملتان آئے ہوئے تھے۔ واپسی پر خواہش کا اظہار کیا کہ لائل پور جانا ہے۔ پچاس روپے یا ساٹھ روپے کی یکطرفہ ٹکٹ تھی۔ چھوٹا سا جہاز تھا۔ فوکر، ہاں فوکر تھا۔ شائستہ ماحول اور لذیذ کھانا۔ ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ اب کسی کو یقین نہیں آئیگا کہ فیصل آباد کے ائیر پورٹ پر پی آئی اے کی سرکاری بسیں کھڑی ہوتی تھیں۔ یہ مسافروں کو کسی بھی اضافی کرایہ کے بغیر کمپنی کے شہری مرکز تک لیکر جاتی تھیں۔ یعنی کسی بھی مسافر کے عزیز و اقارب کو ائیر پورٹ آنے کا تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ یہ مکمل نظام بھی سرکاری تھا۔ اب غور کیجئے۔ سفر کرنے کا ایک بھرپور نظام، حکومت کے زیرِ اثر احسن طریقے سے چل رہا تھا۔ مسائل تو اس وقت بھی تھے مگر انکو عام لوگوں کے تحفظ اور آرام میں مخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

حکومتی سطح پر ہوٹلوں کی طرف دیکھیے۔ سرکار کا لاہور میں انتہائی معیاری فلیٹیز ہوٹل موجود تھا۔ شہر کا سب سے کشادہ اور بہترین ہوٹل۔ والد صاحب کے ساتھ وہاں ٹھہرنے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ اسکے کمرے انتہائی کشادہ تھے۔ کمرے کے درمیان میں ایک دیدہ زیب پردہ لگا ہوتا تھا۔ فیملیز انتہائی مہذب طریقے سے اس جگہ ٹھہری نظر آتی تھیں۔ فلیٹیز ہوٹل کے اندر کمرہ دراصل دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ ایک نشست گاہ اور دوسرا سونے کی جگہ اور درمیان میں پردہ۔ سرکاری ملازموں کو ٹھہرنے کے کرایہ میں کافی سہولت موجود تی۔ پی سی او رہلٹن بھی تھے۔ مگر جو وضعداری، فلیٹیز ہوٹل میں تھی، وہ اپنی طرز میں نمایاں تھی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس ہوٹل میں صوبہ کے تمام سفید پوش لوگ بڑے آرام سے ٹھہرتے تھے۔ سفید پوش کا لفظ حد درجہ اہم ہے۔ اسی طرح جیسے وضعداری کا۔ یہ لفظ نہیں تھے۔ زندگی گزارنے کا ایک رویہ تھا۔ جسکا ادراک شائد آج نہیں کیا جا سکتا۔ یا کوئی کرنا نہیں چاہتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دو الفاظ میں لوگوں کی پوری زندگیاں چھپی ہوئی تھیں۔ سفید پوش اور وضعدار۔ فلیٹیز ہوٹل کا ذکر کر رہا تھا۔ لاہور میں اس بہتر طرز کا کوئی ہوٹل موجود نہیں تھا۔ وہ بھی سرکار کا یعنی پبلک سیکٹر میں۔ ویسے مجھے پبلک سیکٹر کی اصطلاح سے کافی دوری ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ نجی شعبہ بھی سرکار کی معاونت کے بغیر قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ عجیب بات ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر حکومت کے کندھوں پر بیٹھ کر پیسہ کماتا ہے، پھر اسی حکومتی اداروں کا مذاق اُڑاتا ہے۔ بہر حال یہ بحث اَز حد طویل ہے۔ راولپنڈی میں بھی، صدر کے علاقے میں فلیش مین ہوٹل تھا۔ وہ بھی سرکار کی ملکیت تھا۔ بذاتِ خود اس میں کئی بار ٹھہرا ہوں۔ حد درجہ آرام دہ جگہ تھی۔ اب اندازہ نہیں کہ وہ کس سطح پر کام کر رہا ہے۔ فلیٹیز ہوٹل تو بہر حال نیلام کر دیا گیا ہے۔

ریلوے، بسیں، ہوائی جہاز اور ٹھہرنے کیلئے معیاری ہوٹل، یہ سب حکومت کے اندر موجود تھے اور ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔ مطلب یہ کہ سرکاری شعبہ لوگوں کے اندر حفاظت اور آرام کی ذمہ داری احسن طریقے سے نباہ رہا تھا۔ کمیونیکیشن کا یہ پورا نظام کسی

اور ملک کا نہیں۔ ہمارے ہی ملک میں تھا اور ٹوٹی پھوٹی حالت میں آج بھی ہے۔ پرانے نظام میں اتنی سکت تھی کہ اس نے پورا بوجھ اُٹھا رکھا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ہر چیز تبدیل ہوگئی۔ جی ٹی ایس کی بسیں اور سرکاری اڈے تو خیر اب ماضی کا خواب بن چکے ہیں۔ پاکستان ریلوے جس حالت میں چل رہا ہے، اس پر کیا بات کی جائے۔ ہر حکومت نے اسکی بربادی میں بھرپور حصہ ڈالا اور اپنے دورِ حکومت میں ہر ایک اپنے مونہہ میاں مٹھو بنتی رہی۔ آج حالت یہ ہے کہ کبھی چلتے چلتے، ریلوے بوگیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ کبھی پٹری سے ڈبے اُتر کر مسکینوں کی طرح زمین پر پڑے نظر آتے ہیں۔ حادثے بالکل عام ہیں۔ وہ سفر جو محفوظ ترین گنا جاتا تھا۔ اب مکمل طور پر غیر محفوظ ہو چکا ہے۔ یہی حال، پی آئی اے کا ہو چکا ہے۔ ہر سرکار نے اس ادارے پر خوب ہاتھ صاف کیا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ ہمارے جہاز انتہائی غیر محفوظ ہو چکے ہیں۔ فضائی حادثوں میں پی آئی اے نے ناقابل رشک شہرت کما رکھی ہے۔ میرے ایک دوست کا بیٹا بیریسٹر ہے۔ چند دن پہلے، لاہور سے کراچی ایک مقدمہ کیلئے جانا تھا۔ بتانے لگا کہ پی آئی اے کا سفر اب اتنا غیر محفوظ ہو چکا ہے کہ وہ گاڑی چلا کر لاہور سے کراچی گیا اور واپس آیا ہے۔ چودہ پندرہ گھنٹے کا گاڑی چلانا برداشت ہے۔ مگر کسی اور کی غلطی کی بدولت ناحق ہلاک ہو جانا ہرگز ہرگز قبول نہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ وہ بیرسٹر، ہر دس پندرہ دن بعد، لاہور سے کراچی، اپنی گاڑی میں سفر کر کے آتا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کسی بھی سرکاری ادارے پر اطمینان نہ ہونے کا ثبوت اور کیا ہوگا؟ سرکاری شعبہ میں ہوٹلوں کا بھی یہی حال ہے۔ کچھ بک چکے ہیں اور کچھ فروخت ہو جائینگے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ چالیس پنتالیس بلکہ پچیس سال پہلے، سرکاری شعبہ ہر طریقے سے فعال تھا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ بگاڑ آخر کب شروع ہوا اور اسکا انجام کیا ہوگا۔ چلیے، تنزلی تو نظر آتی ہے۔ اس سے ہرگز ہرگز مفر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سنجیدگی سے یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ اس دلدل کا آغاز کب اور کس طرح سے شروع ہوا۔ آخر کوئی جن تو یک دم نمودار نہیں ہوا، جس نے جادو کیا اور ہمارے سرکاری شعبے سے جان نکل گئی۔ یہ فالج زدہ ہو گیا۔ اسکی کارکردگی کو مذاق بنا دیا گیا۔ یہ ڈھلان تو بتدریج ظہور پذیر نظر آتی ہے۔ تبدیلی اور عوامی ترقی کے خون کے آنسو رُلا دینے والے نعرے تو عرصے سے روز سنائی دیتے ہیں۔ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہر حکومت، ماضی کی حکومتوں کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ خزانہ ہمیشہ خالی ہوتا ہے۔ لوگوں کے مسائل بالکل بھی حل نہیں ہوتے۔ مگر اصل سوال ابھی تک موجود ہے۔ یہ بگاڑ کب، کیونکر اور کس کی بدولت شروع ہوا! اس کا منطقی انجام کیا ہوگا! پتہ نہیں کیوں، میں اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتا۔

راؤ منظر حیات